# بشنو

## سالنامہ انجینئرنگ کالج سیمیزین ۷۰-۶۹ء

## پرنسپل محمد عبید اللہ دُرّانی

آج صرف مولانا روم کی مثنوی کے پہلے شعر کے پہلے لفظ کے متعلق کچھ عرض کرنا چاہتا ہوں۔ یہ ایک مشہور بات ہے جو سنتے آئے ہیں کہ

**مثنوی مولوی معنوی ہست قرآں در زبانِ پہلوی**

اور قرآن کریم کے متعلق فقراء کا یہ ارشاد ہے کہ سورۂ فاتحہ یعنی جو قرآن کے رموز کھولدے وہ خود روحِ قرآن کی آئینہ دار ہے۔ اور بسم اللہ اسی دروازے کی چابی ہے' باۓ بسم اللہ اس چابی کی جان ہے' اور ب کا نقطہ اپنا آپ ہے' جو سرِ حق ہے۔ یہ بھی معنی خیز بات ہے کہ قرآن کریم کی شروعات بھی 'ب' سے اور مثنوی مولانا روم بھی 'ب' سے۔ یہ بات محض ادبی موشگافی نہیں بلکہ رمزِ حقیقت سے پُر ہے۔

قرآن کریم کا ارشاد ہے کہ اس کو ہم نے تمہارے قلوب پر اتارا۔ مگر افسوس کی بات ہے کہ چاہے وہ وحی ہو یا الہامات ہم بجائے قلب کے دماغ سے سمجھنے کی کوشش کرتے ہیں۔ جو علت و معلول کا پابند ہے اس کے بوتہ پر عالمِ معنویت تک پہنچنے کی کوشش کرتے ہیں۔ چونکہ ہر عالم کی دوسرے عالم سے نسبت ہے اس لئے کچھ ہلکی پھلکی تشفی تو اس طرح ہو جاتی ہے مگر وہ برہان وہ روشنی نہیں پیدا ہوتی جو قلب کے تاثر سے پیدا ہو سکتی تھی۔

قلب کیا چیز ہے۔ نہ صرف عوام کے تخیل میں بلکہ ظواہر کے عالم بھی قلب اور نفس کا مشکل سے ہی فرق دیکھ پاتے ہیں۔ نفس اور لطیفہ نفس' دماغ سے وابستہ ہے' اور قلب کا رشتہ روح سے ہے۔ اور یہ دیکھا گیا ہے کہ جتنی قدریں نفس اور لطیفہ نفس کی ہیں جیسے اپنی جان کی حفاظت' عیش و آرام' شہرت و اقتدار وغیرہ یہ سب قلب کی سطح پر الٹ جاتی ہیں اور ان کی جگہ جذبۂ شہادت' ایثار' خیرات وغیرہ عود کر آتی ہیں۔ ان وجوہات کی بنا پر یہ ظاہر ہے کہ جب تک دل کی کلی نہ کھل جائے' ہم اس دل سے جو عرش الٰہی کہلاتا ہے کیسے قرآن کریم کو اپنا سکتے ہیں یا بحرِ معرفت جو مثنوی مولانا رومؒ ہے اس کی غواصی کر سکتے ہیں۔ بقول بو علی قلندرؒ

گر عشق نہ بودی و غم عشق نہ بودی
چندیں سخنِ نغز کہ گفتی کہ شنودی

عشق کی انتہائی منزل دیدار مانی گئی ہے۔ وہ محبوب کا آمنا سامنا، وہ دل کی دھڑکنیں، وہ وقت کا ساکت ہو جانا۔ یہ ایسی وارداتیں ہیں جن تک دماغ کی کوئی رسائی نہیں۔ صرف ایک دل ایک دُکھا ہوا دل جس نے برسوں آرزوئے دیدار میں اپنی آنکھوں کی شمعیں روشن کی ہوں وہی جان سکتا ہے اس کیفیت کو اور جن کے قلب اُجاگر ہو گئے ہوں ان کیلئے یہی وصل ہے۔ بقول حضرت بابا فریدؒ کے

کاگا سب تن کھائیو چن چن ماس
دو نیناں مت کھائیو ہے پیا ملن کی آس

مگر دیدار تعینات کا پابند ہے، وجود کے بغیر کس کا دیدار ہو۔ روشنی کا دیدار نہیں ہو سکتا البتہ ایک شمع، ایک شمس کا دیدار ہو سکتا ہے۔ اب سوچیں کہ آواز کیا چیز ہے۔ آواز میں خوشبو کی طرح ایک ایسی لطافت ہے جو تعینات اور مجردات کے درمیان برزخ سمجھی جا سکتی ہے۔ اس لحاظ سے آواز وہ در ہے جو قلب کی دنیا سے اٹھا کر انسان کو روح کی دنیا میں پہنچا دیتی ہے۔ جس طرح محبوب کی صورت جنت نگاہ اور قرۃ العین ہو جاتی ہے اسی طرح محبوب کی آواز میں بھی وہ حسن ہوتا ہے جو روئیں روئیں میں زندگی اجاگر کر دیتا ہے۔ صورت وقت کے گزرنے سے بدلتی رہتی ہے مگر آواز وہی رہتی ہے۔ عرصہ گزرنے پر ممکن ہے جانی پہچانی صورت کو نہ پہچان سکیں مگر مدتوں بعد بھی آشنا آواز فوراً کھٹکتی ہے جیسے کہ اس کا یادداشت سے کوئی تعلق نہیں بلکہ روح کی گہرائی کا نقش سامنے آ جائے۔ آواز کا ایک کیف انسان کو قال سے اٹھا کر حال میں پہنچا دیتا ہے۔ اسی لئے اہلِ دل سماع کو روح کی غذا کہتے ہیں۔ حضرت شمس تبریزؒ فرماتے ہیں

ز وجد خود تو در آئی درمیانِ سماع
بیا کہ معجز خاص تست شانِ سماع

ایک لطیف بات یہ ہے کہ آواز، سانس یا ہوا کی پابند ہے۔ اور یہ جو فرمایا "فانفخت روحی" اسی میں اس کا رمز شامل، کوئی شخص مان لیجئے اس کا نام مشتاق ہے۔ مشتاق کو اگر جلی اور مجلّی خط میں بھی اپنا نام لکھا ہوا سامنے آئے تو وہ یہ کبھی نہ کہے گا کہ یہ نام 'میں' ہوں یا اس کو ایک بہت اعلیٰ مصور کی بنائی ہوئی اپنی تصویر دکھا دیں تو یہ کبھی نہیں کہے گا کہ یہ تصویر 'میں' ہوں۔ بلکہ یہی کہے گا کہ یہ میری تصویر ہے۔ لیکن اگر کوئی مشتاق کہہ کر آواز دے تو فوراً چونکے گا کہ مجھے بلایا ہے۔ آواز اس باطن وجود کو، جس کا عرفان 'حق جل شانہٗ' کا عرفان ہے چونکا کر جگا دیتی ہے۔ آخر یہ شیریں آواز دل کو کیوں کھینچتی ہے۔ کئی مذاہب نے عبادت کا ذریعہ ہی آواز و ساز کی شیریں لطافتوں کے ذریعہ قرار دیا ہے۔ کیونکہ آواز

میں ہی اسمائے الٰہی کے وہ سارے صفات نظر آتے ہیں جو تعینات سے لیکر مجردات تک پہنچا دیتے ہیں۔

مولانا رومؒ اس وجود کو جو" لا الٰہ " کی منزلیں طے کر چکا ہو ایک نے' ایک بانسری کی مثال دیتے ہیں۔ اجسام فلکی سے یعنی روحِ اعظم سے انفرادیت کے بعد یہ نے' یہ وجود کی نے' اپنی بے قراری کا اظہار کرتی ہے۔ اور ایسے کہ اس کا ایک سرا عدم میں ہے اور دوسرا جس کے ذریعہ یہ آواز آ رہی ہے' وجود کا لباس اُوڑھے ہوئے اور جو شیرین دل کو کھینچنے والی روح و قلب کو رجوع کرنے والی درد بھری غم کی تلخی لئے ہوئے یہ آواز' یہ تلخ شیرین آواز ایسی ہے جیسے ایک ماں کے دل کی آواز اپنے بچھڑے ہوئے بچے کیلئے' یہ آواز وہی سن سکتا ہے جو بقول مولاناؒ کے کہ

چشم بند و گوش بند و لب ببند
گر نہ بینی سر حق بر من بخند

جب آنکھیں بند کیں اور باطن کو ایک رخ ملا تو بصیرت حاصل ہوئی۔ جب کان بند کئے اور توجہ ایک مرکز پر جمی رہی تو اس نے' کی آواز سننے میں آئی۔ اور جب لب بند کئے اور انتظار کی سانسیں کھینچتے رہے تو الہامات یا حدیثِ قدسی کا نزول ہوا۔

آواز کے ذریعہ الفاظ جامہ پہنتے ہیں اور تنزل کے بعد ذہن تک رسائی ہوتی ہے۔ مگر جب آواز سے الفاظ کا جامہ اتار دیں بلا واسطہ اس کی رسائی قلب کے در سے روح تک پہنچتی ہے۔ یہی نے' کی آواز ہوتی ہے۔ روح کی آواز کی متحمل روح ہی ہو سکتی ہے۔

دمدمہ این نے از دم ہائے اوست
یا ڈھوئے روح از ھیہائے اوست

اکابر بزرگان دین کا قول ہے کہ قلب و روح کے درمیان ایک آہنی دیوار ہے جو موت سے پہلے پار کرنا بہت دشوار ہے۔ اسی لئے کہا گیا ہے کہ انسان اگر اپنے حقیقی مقام تک پہنچنا چاہے تو " موتو قبل انت موتو " کی چوکھٹ پار کرے۔ بقول غوث پاک کے ایک ٹوٹے ہوئے دل میں نور سما سکتا ہے۔ یہ ٹوٹا ہوا دل وہی ہے جس کے متعلق حضرت بو علی شاہؒ نے فرمایا

گر عشق نبودی و غم عشق نبودی
چندیں سخنِ نغز کہ گفتے کہ شنیدی

اس ٹوٹے ہوئے دل کے ذریعہ جب ''فاذکرونی اذکرکم'' کے تحت ''اذکرکم'' کی آواز کوئی سنتا ہے تو زندگی سے ماوراءالحیات کی ایک موج اسکے وجود میں اُبھرتی ہے اور وہ آہنی دیوار جیتے جی پار ہو جاتی ہے بقول غالب

بجلی اک کوند گئی آنکھوں کے آگے تو کیا
بات کرتے کہ میں لب تشنہ ٔ تقریر بھی تھا

انبیاء علیہ السلام کی تاریخ میں موسیٰ کلیم اللہ کہلائے اور عیسیٰ روح اللہ۔ کلام سے قلب کا در کھلا اور عیسیٰ کی منزل تک یہ پہنچکر انسانیت کا روح میں قیام ہوا۔ وہ ''رب ارنی'' اور ''لن ترانی'' کی تکرار۔ یہ عشق کی واردات نہیں تو اور کیا ہے۔ اس کی شیرینی اور دل نوازی کوئی کیا سمجھے۔ یہ جو ہم اللہ اللہ کرتے رہتے ہیں اس کے جواب میں اگر ہم اپنا نام سنتے رہیں' سنتے رہیں اور سنتے رہیں اور اسی میں سو جائیں تو جب آنکھ کھلے گی تو یہی دیکھا جائے گا کہ نئے' نیستان میں جمعیت کی برکات کے ساتھ ''یسبح و بحمدہ' '' میں مسرور و مطمئن ہے۔

اب چلئے ابتدائے آفرینش'' کن '' کی طرف۔ یہ کیا تھا۔ ایک آواز ہی تھی یا ایک حکم تھا جو آواز کے ذریعہ ادا ہوا اور کائنات وجود میں آئی۔ نیستان آباد ہوا۔ نیستان میں کیا ہوا۔ ''الست بربکم'' اور ''قالو بلیٰ''۔ سبحان اللہ۔ کاش کہ آج بھی اور ہمیشہ سے اور اب تک یہی ''الست بربکم'' اور ''قالو بلی'' ہوتا رہتا۔ یہ بات تو ''رب ارنی'' اور ''لن ترانی'' سے بھی پیاری بات ہے۔

## بشنو' بشنو' بشنو

فقراء یہی کہتے ہیں کہ اگر اپنی روح میں قیام کرلو تو یہ آواز اب بھی سنائی دیتی ہے اور اس نئے' کی یہ پُر درد آواز کی شیرینی اور کشش اب بھی محسوس کر سکتے ہیں۔ اسی لئے مولانا نے فرمایا۔

سینہ خواہم شرحہ شرحہ از فراق
تا بگویم شرح دردِ اشتیاق

یہ صوتِ سرمدی مراقبہ میں فقراء سنتے ہیں۔ یہ صوتِ سرمدی وہی ہے جو اس کٹی ہوئی نئے ' کی جڑوں کی تڑپ ہے۔ یہ ماں کی آواز ہے، روحِ اعظم کی صدا ہے۔ بشنو بشنو۔ جس نے یہ آواز سن لی اسے تشفی ہوگئی۔ کیونکہ دیکھ لیا تو اور آگ بھڑک اٹھی۔ سن لیا تشفی ہوگئی۔

یہ نوزائیدہ بچے کے کانوں میں اذان۔ روح کو اذان ہے۔ اللہ اکبر۔ ''قالو بلیٰ''۔ ہم اپنی روح کی آواز سن

پاتے، اپنے اصل سے ملنے کے لئے فریاد تو " قالوبلیٰ" کی بازگشت ہماری زندگی کا سرمایہ بن جاتی۔ اپنی حقیقت کا بھید اپنے پر آشکار ہو جاتا۔

کیونکہ بقول مولاناؒ

سرِ من از نالۂ من دور نیست

لیک چشم و گوش را آں نور نیست

عشق اور کلام کے متعلق ارشاد ہے کہ یہ اللہ تعالیٰ کی ازلی صفات میں سے ہیں۔ یہ بھی فرمایا کہ علم و حکمت کی بنیادیں کلام سے بنائیں، حضرت عیسیٰ کو روح اللہ، کلمۃ اللہ کہا۔ جب یہ کیفیت عیسوی اپنے اوپر سے گزر جائے تب صحیح معنوں میں روح کا مقام معلوم ہوتا ہے۔ پہلے پہلے تجلیات آتی ہیں، پھر کلام، غارِ حرا میں بھی پہلے چھ ماہ خواب آتے رہے پھر کلام آیا۔ جبرئیلؑ بھی آواز کے پیام رساں بنے، ورنہ جو کہنا تھا وہ تجلیات کے ذریعہ اسماء یا آیات پہنچا کر بھی ہو سکتا تھا۔ گویا ولایت تک نور ہے۔ اور کلام ایسا معلوم ہوتا ہے کہ نبوت کا پرتو ہے۔ اس میں شیطان کی مداخلت نہیں ہو سکتی۔ یوں خواب میں اپنی صلاحیت کے اعتبار سے روپ بدلتے رہتے ہیں۔ لیکن آواز نہیں بدلتی۔ یہ آواز ایسی چیز ہے کہ رگ رگ میں بس جاتی ہے۔ اس لئے کہ اس کا تعلق روح سے ہے۔ معراج میں وہ آگے آگے حضرت بلالؓ کے پیروں کی آواز اور حضرت ابوبکر صدیقؓ کی آواز میں شرفِ کلام حق۔ یہ اس

شدت تعلق کا پتہ دیتے ہیں جو روح کی سطح سے بھی اوپر کا لگاؤ معلوم ہوتا ہے۔ وہ معراج میں ادھر سے " التحیات اللہ " اور ادھر سے "السلام علیک " اس کا کیف پس۔ اس حقیقت سے دوچار ہوں کہ

در حیرتم کہ بادہ فروش از کجا شنید

یہ ہے بشنو کا انداز۔ یہ ہے سمع اللہُ لمن حمدہ۔ یہ ہے وہ انداز جس کی بابت

مولاناؒ نے فرمایا،

**بشنو از نے چوں حکایت می کند**

**از جدائی ہا شکایت می کند**